ترجمہ، عملِ خیر بھی تو ہے

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

Abstract:

Act of translation has always been a way adding peace and increase in knowledge and arts. However, religious extremists have always been creating obstacles in this path. The article highlights the difficulties of translators and their role in establishing a progressive and peaceful society. Translators surely have a very powerful role in the current progress of Urdu literature.

ابتداء میں ہمارے تخلیقی ادب کو مخصوص نوع کی مغربی روش کا سامنا رہا، جس کے باعث ہمارے افسانوی ادب کا بیشتر حصہ 'اینگلو انڈین ادب' کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے۔

میں یہ قطعاً نہیں کہوں گا کہ ہمارے مترجمین کو اوائل بیسویں صدی کی قومی تحریکوں کا ہمنوا ہو کر ہی تراجم کی طرف آنا چاہیے تھا۔ مُدّعا یہ ہے کہ ہمیں مغربی ادبیات کا مطالعہ مخصوص معاشرتی حوالوں، ذہنی رویّوں اور ضرورتوں کی مناسبت سے کرنا چاہیے تھا اور کرنا چاہیے۔ نیز، اسلوبیاتی دائرۂ عمل کے بارے میں منصوبہ بندی کی ضرورت تھی اور ہے۔

محمد حسن عسکری نے ان عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے ترجمے کی روایت کو کھنگال ڈالا۔ اور اُس کا ردِّعمل، خود اُن کے کیے ہوئے تراجم ہیں۔ اس روایت کو شفیق الرحمٰن اور ممتاز شیریں نے آگے بڑھایا۔

ماضی کی بات کریں، یا زمانۂ حال کی، ہم ترجمے کی اہمیت سے ناواقفیت کی بنا پر اسے تخلیقی مسئلہ نہیں سمجھتے۔ یہ الگ قضیہ ہے کہ دوسری زبانوں کے ناول نگاروں خصوصاً وکٹر ہیوگو، الگزینڈر ڈوما، ٹالسٹائی، تورگنیف، زولا، بالزاک، اناطول فرانس اور اسکاٹ کے تتبع میں شاد عظیم آبادی، سجاد عظیم آبادی، عبدالحلیم شرر، راشد الخیری اور مرزا ہادی رُسوا نے اردو میں ناول نگاری کا فن متعارف کروایا --- اور اُن سے قبل نذیر احمد دہلوی کے تمثیلی قصوں کی کردار نگاری میں پائی جانے والی کردار نگاری میں نفسیاتی تجزیہ کاری چارج ایلیٹ سے مخصوص ہے۔ اسی طرح جب مرزا

ہادی رُسوا نے میری کو ریلی کے ناولوں کے اردو تراجم کے ذریعے جاسوسی ادب کو اردو دنیا سے متعارف کروایا تو یہ فن، ظفر عمر کے ہاں باقاعدہ سُراغ رسانی کے ادب میں ڈھل گیا۔ تیرتھ رام فیروز پوری کے طبع زاد جاسوسی ناول اس سے اگلا قدم تھے اور پھر اپنے اہلِ صفی سامنے آئے۔ لیکن، اسالیب بیان تک رسائی کا جتن بھی تو کرنا تھا، وہ نہیں ہوا۔

ہم نے 'رہس' اور 'ٹوٹنکی' کو ناکافی خیال کرتے ہوئے ممبئی کے پارسی تھیٹر کی معرفت ڈراما کی مغربی دنیا سے رشتہ جوڑنے کی سعی کی۔ یوں بہت ہوا تو رفیع پیر، اشفاق احمد، فاطمہ ثریا، بانو قدسیہ، کمال احمد رضوی اور حسینہ معین ہاتھ آئے۔ اب ان کا موازنہ مغرب کے بڑے ڈراما نگاروں سے کر کے دیکھ لیجئے۔ ہم ہیچ ہی دکھائی دیں گے۔ اُن ڈراما نگاروں کا کیا ذکر کریں، جو کان پر قلم دھرے ٹیلی وژن سٹیشن کے چکر لگاتے ہیں۔

ہمارے ہاں ابتداء میں تین افسانہ نگار بہت ترجمہ ہوئے۔ رابندر ناتھ ٹیگور، گورکی اور موپاساں--جن سے اسلوبیاتی سطح پر ہم خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ یا پھر سمرسٹ ماہام ترجمہ ہوا، جس سے اثر پذیری کی سب سے اہم مثال کرشن چندر تھے۔ آج بڑے افسانہ نگاروں کا ذکر کریں تو اکثر ہمیں کرشن چندر کا نام یاد نہیں رہتا۔ اس کے برعکس کیسی عجیب بات ہے کہ ہمارے ہاں مغرب سے بہت کم طنز و مزاح ترجمہ ہوا، پھر بھی ہم محمد خالد اختر اور مشتاق احمد یوسفی کے کام کے ساتھ ثروت مند دکھائی دیتے ہیں اور وزیر آغا کے انشائیے چارلس لیمب، ہیزلٹ، ڈی کوئنسی، چسٹرٹن اور اسٹیونسن کے تراجم کے مرہونِ منت نہیں۔

دوسری اہم جہت قیامِ امن میں مترجم کا کردار ہے۔ اس حوالے سے ترجمہ ایک ایسا عملِ خیر ہے جو ہمیشہ امن و آشتی، نسلِ انسانی کی فکری تربیت، زبان و بیان میں بڑھوتری اور علوم وفنون میں اضافے کا سبب بنا۔ بے شک، رجعت پسند سوچ نے عملِ ترجمہ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ عملِ ترجمہ کو گناہ تصور کیا اور مترجم کو ہر ہر قدم پر شدید مشقت کے بدلے میں صرف و محض حقارت ہی نصیب ہوئی۔

۲۵۰ قبل مسیح کے پہلے معلومہ مترجم لیویس اینڈرونیکس (Livius Andronicus)، جس نے ہومر کے لافانی رزمیہ 'اوڈیسی' کو لاطینی زبان میں ترجمہ کیا، گمنامی کی موت مرا۔ انگریزی میں بائبل کو ترجمہ کرنے والے ولیم ٹنڈیل کو تو قبر بھی نصیب نہیں ہوئی، اس لیے کہ ۱۵۳۶ء میں پھانسی دینے کے بعد اس کی لاش کو آگ میں جھونک دیا گیا تھا۔ خود ہمارے ہاں جب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے قرآنِ حکیم کا پہلا فارسی ترجمہ اور شاہ عبدالعزیز دہلوی نے پہلا لفظی اردو ترجمہ کیا تو انہیں اس کا صلہ سوائے نفرت کے کیا ملا؟ نذیر احمد دہلوی کے بامحاورہ 'ترجمۂ قرآن' کے بعد ان سے عالمانہ مذہبی تقدس چھن گیا۔ یہ ہے رجعت پسندی اور 'خستہ و خراب حالت موجود' کے مقابل کھڑے ہونے کا نتیجہ۔

اب اس حوالے سے دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہی کہ رجعت پسند سوچ نے ہماری معاشرت کا کیا حال کیا۔ ہم امن وسکون سے کس حد تک تہی دست ہو گئے۔ جب کہ status quo، جو ہڑ کے ٹھہرے ہوئے بدبو دار پانی کے مماثل ہے، جسے انسان تو انسان، جانور بھی پینا پسند نہیں کرتا۔ گمنام اینڈرونیکس نے یہی کیا تھا نا کہ

ہومر کے سمندری اسفار اور اس کے تخیلاتی جہان کے ادغام سے جنم لینے والے منظوم قصے کو خواب دیکھنے اور دکھانے والوں کے لیے عام کر دیا۔ مظلوم و مقتول ولیم ٹنڈیل، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور نذیر احمد نے زبان کا بیریئر توڑ کر کلامِ الٰہی کو عام فہم بنا دیا--بس یہی قصور تھا اُن کا۔

ڈاکٹر سیموئل جانسن کے تحریر کردہ قصے کے مترجم سید محمد میر لکھنوی کا ''تواریخ راسلس، شہزادہ حبش کی'' اردو کا پہلا ادبی ترجمہ ہے جو آگرہ سے ۱۸۳۹ء میں طبع ہوا۔ یہ اس دور کے جامد معاشرے میں خواب دیکھنے اور دکھانے کی کوشش تھی۔ اس سے قبل اسی مترجم نے ریورنڈ چارلس کی چھے جلدوں میں تحریر کردہ کیمسٹری کی کتاب کا اردو ترجمہ ۱۸۲۸ء میں کر کے درسِ نظامی کے تالاب میں پہلا کنکر پھینکا تھا، تا کہ ارتعاش پیدا ہو--تعلیم اور تعلم کی سطح پر، حالتِ موجود میں تبدیلی آئے۔ جس کے نتیجے کے طور پر ہمارے ہاں سائنسی فکر کو عام کرنے اور تعلیمی نظام میں مثبت تبدیلی لانے کی خاطر نواب محمد فخر الدین خاں نے حیدر آباد، دکن میں دارالترجمہ قائم کیا، جس میں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ سے مستعفی ہو کر میر امّن دہلوی نے مسٹر جونز اور موسیو تنڈرس کی مدد سے علمِ جرِثقیل، علم ہیئت، علم آب، علم ہوا، علم مناظر و ارعلم برقک سے متعلق ریورنڈ چارلس کے آٹھ سائنسی رسائل کا اردو ترجمہ کیا۔ یوں ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے ہنگام تک آگرہ اور حیدر آباد، دکن میں عمل ترجمہ کے ذریعے سائنسی فکر تک رسائی کی کوشش کی گئی۔ جب کہ اردو زبان میں نئے اسالیبِ بیان، نئے طرزِ احساس اور پیرائیہ اظہار میں صلابت، متانت اور استدلال کو بڑھاوا دینے کی خاطر، فورٹ ولیم کالج کی پالیسی سے آزاد رہ کر جان گلکرسٹ نے 'ہندوستانی زبان کے قواعد' (۱۷۹۶ء) لکھتے ہوئے ولیم شیکسپیئر کے منظوم ڈراما: 'ہیملٹ' میں سے کارڈی نل وڑے اور شاہزادہ ہیملٹ کی خود کلامیوں کو اردو میں ترجمہ کر دیا تھا، جس کی عطا اردو کے مشہور ڈراما نگار آغا حشر کاشمیری ہیں۔

باشعور، بے تعصب اور پُرامن معاشرے کے قیام کے لیے عمل ترجمہ کے ذریعے یہ ابتدائی اقدامات ہیں اور یوں متحدہ ہندوستان میں طرزِ زیست کی سطح پر التمش، جلال الدین محمد اکبر، نور الدین جہانگیر اور شاہجہاں کے غیر متعصب پُرامن عہدِ رفتہ کی بازیافت کی گئی۔ محمود ہاشمی سے الفاظ مستعار لُوں تو یہ عمل صالح یکسر ویسا ہی ہے، جیسے ایزرا پاؤنڈ نے تراجم کی معرفت مشرقی فلسفے اور مشرقی شاعری کے لحن کی ضرورت محسوس کی اور ٹی۔ ایس ایلیٹ "Waste-Land" لکھ کر ''اوم شانتی شانتی'' کی منزل تک پہنچا۔(۱)

حالات سے اُوبھ کر محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے تاریخی مشاعرے ۱۸۷۴ء میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''نئے انداز کے خلعت اور زیور جو آج کے مناسب حال ہیں، وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں، صندوقوں کی کنجی ہمارے وطن کے انگریزی دانوں کے پاس ہے۔''

آزاد ہی نے ''آبِ حیات'' میں لکھا ہے:

> ''ہاں، یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے، جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی، دونوں دریاؤں کے

کناروں پر قابض ہو گئے ہیں۔ان کی ہمت آبیاری کرے گی۔دونوں کناروں سے پانی لائے گی۔''(۲)

آزاد کے یہ دونوں بیانات معاشرے میں عقل وشعور کی معرفت مثبت تبدیلی لانے کی خواہش کا اظہار ہیں اور وسیلہ،عملِ ترجمہ۔لیکن ہمارے ہاں ابتداء میں ایک عجب طرح کا احساسِ کمتری دیکھنے کو ملا جو اردو زبان کو کم مایہ تصور کرنے سے پیدا ہوا۔

۱۹ویں صدی میں سید سلیمان ندوی نے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے:

''.....ہمارے انگریزی خواں دوست اردو اخبارات اور تصنیفات کو ہاتھ تک لگانا جرم سمجھتے ہیں۔ترجمے کے لیے انگریزی کی دوسطریں دیجیے تو یہ کہہ کر مغرورانداز سے کاغذ میز پر رکھ دیں گے کہ:''بڑی مشکل ہے کہ اس کے لیے اردو میں الفاظ نہیں۔''اردو میں الفاظ نہیں یا آپ کی نظر میں وسعت نہیں۔''(۳)

یہ مشکل تب ٹلی، جب ترجمہ نگاری روزی روٹی کا ذریعہ بنتی چلی گئی۔شبلی نعمانی نے سالانہ رپورٹ: انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۰۳ء میں اس حوالے سے بہ ملا بات کی ہے۔کہتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ہماری ملک میں اس مسئلے کی طرف لوگوں کو علم نے نہیں، بلکہ ضرورتِ معاش نے متوجہ کیا ہے۔''

تاوقتیکہ ۱۹۱۹ء میں سید ہاشمی فرید آبادی جیسے بڑے مترجم سامنے آئے تو ہاشمی فرید آبادی کی ترجمہ کردہ کتاب :''تاریخِ یونان''(از جے۔بی بیوری) کا مقدمہ لکھتے ہوئے مولوی عبدالحق نے لکھا:

''اس وقت قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمہ کے ذریعے دنیا کی اعلیٰ درجہ کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات(۴) میں اضافہ کریں گے۔ جمود کو توڑیں گے اور قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے۔''

شکر الحمد کہ ہم اس راہ پر چل نکلے۔میں ۱۹۷۴ء تا حال--بیالیس برس سے ترجمے کے فن اور کتابیاتِ تراجم پر کام کر رہا ہوں لہٰذا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس خصوص میں ہماری پیش رفت کیا رہی۔رسائل و جرائد میں بکھرا ہوا غیر مرتب ترجمہ کردہ مواد کئی لاکھ صفحات پر مشتمل ہے۔علمی کتب، جو ترجمہ ہو کر باقاعدہ کتابی صورت میں طبع بھی ہو گئیں، ان کی تعداد چار ہزار سے زاید ہے۔(۱) اخلاقیات (نظری مباحث ومتفرق) (۲) انجینئرنگ بابت معماری وکل سازی (از قسم: آب پاشی، معماری، صنعتی برق، حرفہ وفلزیات) (۳) تاریخ (تاریخِ اسلام، تاریخِ امریکہ، تاریخِ عالم، تاریخِ یورپ، تاریخِ پاک و ہند ومتفرق) (۴) تعلیم و تدریس (از قسم: تاریخِ تعلیم، تعلیمی نفسیات، تعلیمی منصوبہ بندی، تنظیم مدرسہ، راہنمائی و مشاورت، طریقۂ تدریس، فلسفۂ تعلیم اور نصابِ تعلیم) (۵) جغرافیہ (اصولِ جغرافیہ، مدنی جغرافیہ) (۶) جنرل سائنس (۷) حیاتیات (حیوانات، نباتیات) (۸) ریاضیات (احصاء، الجبرا، جیومیٹری، علم حساب، مساحت ہندسہ، مثلث تحلیلی و کروی (۹) زراعت (۱۰) سیاسیات (نظری

مباحث، مختلف ممالک کی سیاست) (۱۱) صنعت (۱۲) طب (اصولِ طب، جراحی، طبّی مشاورت، علم الابدان، علم الادویات، علم صحت، فن قبالت، ہومیوپیتھی) (۱۳) طبیعات (اصولِ علم طبیعات، آواز، برقیات، پیمائش، جوہری توانائی، حرارت، حرحرکیات، حرکیات وسکونیات، روشنی، مادہ، مقناطیس، میکانیات (۱۴) عمرانیات (آبادی، ثقافتی انسانیات، رسوم و رواج، سماجی بہبود، سماجی درجہ بندی، معاشرہ، عمومی عمرانیات) (۱۵) فلسفہ (۱۶) قانون (اصولِ قانون، اسلامی قانون، ایکٹ ہائے مصدرہ، دستور، قوانین عائلی زندگی، اُجرت، اراضی، انکم ٹیکس، پولیس، فوج، بین الاقوام، ٹارٹ و معاہدہ جات داد رسی خاص، دستوری، دیوانی، رجسٹری، فوج داری، مرکنٹائل لاء، مائنز ایکٹ (۱۷) عملی کیمیا (غیر نامیاتی، طبیعی، فعلیاتی، نظری نامیاتی) (۱۸) مذہبات و روحانیات (۱۹) معاشیات (اطلاقی، جزوی، کُلی) (۲۰) موسمیات (۲۱) نفسیات (مبادی، فزیولوجیکل، پیمائشی، تعلیمی، تقابلی، سماجی، عمومی، غیر طبعی، کلینیکل، پیرا سائیکالوجی (۲۲) اسٹرونومی۔

غرضیکہ کونسا علم ہے، جو اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ عمل ترجمہ نے انسانی علم میں اضافہ کر کے امن اور چین ارزاں کیا اور مختلف النوع عصبیتوں کے خاتمے کا ذریعہ بنا۔

ترجمے کی معرفت زندگی کرنے کا قرینہ، طور اطوار، رواج اور ضابطے بین الاقوامی سطح پر فروغ پا کر قیام امن کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس لیے کہ نظریاتی مفاہمت کی راہ ہموار کرنے کا بہترین ذریعہ عمل ترجمہ ہی ہے۔ کیوں نا اسے ''موازنۂ ادب'' کی عالمی تحریک کی طرح برت کر دیکھا جائے، جس کے ذریعے امن، جمہوریت، بھائی چارے اور آزادیِ اظہار کو ترویج ملی۔ یہاں میرا اشارہ ۱۸ویں صدی عیسوی کے ولیم جونز کی ہیبت سی آواز کی طرف ہے، جسے برطانیہ کے رَو (Roe) اور امریکہ کے ناول نگار ایرک سیگل (Erich Segal) نے بھائی چارے کے ایک طاقتور لحن میں بدل دیا۔

عملِ ترجمہ کے ذریعے پُر امن معاشرے کے قیام کے عملی نمونے ارنسٹ فینولوسا، ایز را پاؤنڈ اور آرتھر ویلی کے منظوم تراجم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے قدیم مشرقی شعری لحن کو مغربی شاعری کے ساتھ گھلا ملا دیا۔ اور جب ایز را پاؤنڈ نے اکبری عہد کے بھگت کبیر کے چند دوہے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے بعد کیفوز لکھے تو اس کی شاعری میں 'کہت کبیر' کی گونج نمایاں تھی۔

رہا یہ سوال کہ ترجمہ کرنے کو متن (text) کا انتخاب کیسے ہو؟ تو اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اس ضمن میں ہم ادب عالیہ کی بنیادی خوبی "selfless well wishing" سے مدد لے سکتے ہیں۔ ادب عالیہ میں conflict سے cooperation کی طرف بے تعصب اور بے لوث پیش قدمی کی جاتی ہے۔ یوں ہر اچھا مترجم text کے انتخاب میں level of tolerance سے راہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

حوالہ جات:

(۱) محمود ہاشمی: ''ایک خطرناک میلان''، مضمون مطبوعہ: **اوراق**، لاہور، شمارہ: ۴، بابت: ۱۹۶۶ء، ص: ۱۱۶

(۲) آزاد، محمد حسین: **آبِ حیات**، مطبوعہ: لاہور، طبع اوّل: ۱۸۸۱ء

(۳) ندوی، سیّد سلیمان: **نقوشِ سلیمانی**، ص: ۱۹۹

(۴) عبدالحق دہلوی: مقدمہ: **تاریخِ یونان**، مطبوعہ: دارالطبع سرکارِ عالی، حیدرآباد، دکن، طبع اوّل: ۱۹۱۹ء، ص: ۳